رسائل و مسائل

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

"ڈارون کا نظریۂ ارتقاء موجودہ زمانہ کے علمی مسلمات میں سے ہے، مگر قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں قطعی تضاد ہے۔ سب سے زیادہ صریح بات جو یک نظر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا انسان اول روز سے انسان ہی تھا جسے ایک خاص تاریخ کو یکایک ایک تخلیقی عمل کر پیدا کر دیا گیا، پھر اس سے انسانی نسل چلی لیکن ہم کو جو طبعی علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ شہادت دیتے ہیں کہ انسان حیوانات میں سے بتدریج ترقی کرتا ہوا آیا ہے اور اس ارتقائی تسلسل میں کسی نقطہ پر انگلی رکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص تاریخ کو اس مرحلہ پر حیوانیت ختم ہوئی اور اس انسانیت کی ابتدا ہوئی جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فَإِذَا نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ۔ یہ قرآن اور نظریۂ ارتقاء کے اختلاف کی صرف ایک صریح مثال ہے، ورنہ تخلیق کے مسئلے میں بکثرت تفصیلات ایسی ہیں جہاں ان دونوں کے بیانات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر موجودہ سائنس کا ایک طالب علم اپنے ایمان کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ کیا آپ اس مشکل کا کوئی حل بتا سکتے ہیں؟"

آپ نے جو سوال کیا ہے خط و کتابت اس کے جواب کی کہاں متحمل ہو سکتی ہے۔ ایک نظریہ جو بڑے دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور موجودہ دور کے تمام بڑے بڑے علوم میں سرایت کر چکا ہے، اس کا تنقیدی مطالعہ اور قرآن کے بیانات سے اس کا تقابل ایک مستقل تحقیقی بحث چاہتا ہے جس کے لیے ایک مضمون میں بھی گنجائش نہیں نکل سکتی کجا کہ ایک مختصر خط میں۔ تاہم آپ کے اطمینان کے لیے چند اشارات کیے دیتا ہوں۔

پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ ڈارون کا نظریہ جس طرح ابتدا میں صرف ایک نظریہ تھا اسی طرح آج تک نظریہ (Theory) ہی ہے، واقعہ (Fact) ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ نظریہ اور واقعہ کا فرق آپ جیسے تعلیم یافتہ آدمی سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کے لیے اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنے کا سوال صرف وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ چیز جس پر وہ ایمان رکھتا ہے کسی ایسی چیز سے ٹکرائے جو ثابت شدہ واقعہ ہو۔ قیاسات و نظریات کی ٹکر بھی جو ایمان نہ سہ سکے وہ کسی کام کا ایمان نہیں، خصوصاً جبکہ ان "علمی" قیاسات کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ یہ بیچارے خود ایک صدی کے علمی تغیرات کی ٹکر بھی مشکل ہی سہ سکے ہیں۔

علم الحیات (Biology) کے جس مشکل ترین مسئلہ میں سائنس کے علماء الجھ رہے ہیں وہ دراصل یہ سوال ہے کہ زندگی کا مبدأ کیا ہے۔ قرآن اس کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کا مبدأ خدا کا حکم (امر رب) ہے۔ وہ صرف خدا کا حکم ہی ہے جو بے جان مادے میں آثار حیات پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن موجودہ سائنس جن لوگوں کے ہاتھوں نشو و نما پا رہا ہے وہ اس کارخانۂ ہستی میں کسی فوق الفطرت ذات (Super natural) کی کارفرمائی و کاریگری ماننے اور محسوس کرنے سے ہر ممکن طور پر پہلو بچانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اسی کارگاہِ فطرت میں انھیں اس کی کارفرما طاقت کا بھی کہیں سراغ مل جائے۔ یہی بنیادی غلطی ان کے لیے وہ مشکل سوالات پیدا کرتی ہے جنھیں حل کرنے کے لیے وہ قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور پھر اسی قیاس آرائی کا سلسلہ اشیائے کائنات کے تنوع اور ان کے تفاصیل کی توجیہ تک دراز ہوتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ فی الواقع علمی ذوق رکھنے والے ہیں وہ تو قیاس کو قیاس ہی کی حد تک رکھتے ہیں، لیکن جو کم تر درجہ کے نوآموز ہیں (جن کو میں "علمی کم ظرف" اور دنیائے علم کا "نو دولتا" سمجھتا ہوں) ان کا حال یہ ہے کہ قیاسات و نظریات کو اس شان سے بیان کرتے ہیں گویا وہ حقائق ہیں جو علمی طور پر ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی سے سائنس کے مبتدیوں کو غلط فہمیاں لاحق ہوتی ہیں۔

ڈارون نے جب تحقیق و تجسس کا آغاز کیا اس وقت اگر وہ قرآن کے دیے ہوئے نقطۂ آغاز (Starting point) سے چلتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ زندگی کی شکلوں میں یہ تنوع اور تفاصیل جو ایک بے نظیر ترتیب کے ساتھ واحد الخلیہ

بھنگے (Unicellular molecule) سے لے کر انسان تک نظر آ رہا ہے، یہ ایک حکیم کے منصوبے (Design) کا نتیجہ ہے جو مختلف انواع کی زندگی کے لیے مناسب ماحول اور سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد انھیں ان کی مخصوص نوعی خصوصیات کے ساتھ بتدریج وجود میں لاتا چلا گیا ہے اور جن انواع کی ضرورت اس کے منصوبے میں باقی نہیں رہی ہے انھیں مٹاتا بھی رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ لوگ منصوبہ ساز (Designer) کو ماننے سے جی چراتے ہیں اور اس کی کارگاہ میں اس کی کارفرمائی کے نشانات دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے جو شہوات ان کے مشاہدے میں آتے ہیں ان کی توجیہ یہ کسی ایسے طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ کارخانہ خود بخود چلتا اور ترقی کرتا ہوا سمجھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈارون نے تنوع اور تفاضل کی توجیہ ارتقاء کے اُس نظریہ سے کی جو اس کے نام سے مشہور ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ نے جو اس وقت تک اپنے الحاد کو پاؤں کے بغیر چلا رہا تھا، لپک کر یہ لکڑی کے پاؤں ہاتھوں ہاتھ لیے اور نہ صرف اپنے سائنس کے تمام شعبوں میں، بلکہ اپنے فلسفہ اخلاق اور اپنے علوم عمران تک میں اُن کو نیچے سے فٹ کر لیا۔ حالانکہ علمی اور عقلی حیثیت سے اِس کی توجیہ میں اتنے جھول ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی صاف دماغ کا آدمی اس کو منطقی ممکن توجیہات میں ایک قابل لحاظ توجیہ قرار دے سکتا ہے۔

پیچیدہ اور گہری علمی تنقید سے بچتے ہوئے میں آپ کو ایک مثال سے ڈارونی نظریہ ارتقاء کا اصلی و بنیادی ضعف سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ فرض کیجیے کہ مریخ سے سائنس کا ایک پروفیسر اپنے کچھ شاگردوں کے ساتھ علمی تحقیقات کے لیے زمین پر آتا ہے اور ان لوگوں کی بینائی میں کوئی ایسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ یہاں انسان کو نہیں دیکھ سکتے البتہ انسان کی مصنوعات اور اس کے تمدن کے آلات و وسائل کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ محقق پروفیسر یہاں انسان کی جو صنعت دیکھتا ہے ان میں اسے شکلوں اور نوعیتوں کا فرق بھی نظر آتا ہے، ان میں سے بعض کو وہ بعض سے بہتر بھی پاتا ہے، دوران تحقیق میں اس کو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض چیزیں پہلے رائج نہ تھیں، بعد میں رائج ہوئیں، بعض قدیم سے رائج رہی ہیں اور اب تک رائج چلی آ رہی ہیں، اور بعض پہلے رائج تھیں مگر اب مفقود ہیں۔ کچھ زمانہ تک وہ اس بکھرے ہوئے منظر کی اشیاء کو اپنے ذہن میں مرتب کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ مختلف قسم کی اشیاء کو انواع اور اصناف میں تقسیم کر کے

ان کے درجات قائم کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تحقیق کا قدم آگے بڑھاتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر یہ تنوع اور تفاضل اشیاء میں کیسے، اور ان کے تنوع اور تفاضل میں اور بعض کے باقی اور بعض کے معدوم ہو جانے میں کیا اسباب اور کیا قوانین کار فرما ہیں۔ اس سوال کا ایک جواب اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں غلباً ایسی اور ایسی صفات کی کوئی ہستی موجود ہے جو ان چیزوں کو اپنی مختلف مصلحتوں کے لحاظ سے بناتی ہے، جن چیزوں کی ضرورت باقی ہے انھیں بنائے چلی جاتی ہے، جن کی ضرورت باقی نہیں رہی انھیں بنانا چھوڑ چکی ہے، اور جن کی ضرورت اب کسی دوسری شکل کی چیز سے بہتر طور پر پوری ہونے لگی ہے انھیں بنانا چھوڑتی جا رہی ہے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ تاریخی محقق کسی ایسی ہستی کو فرض کرنے سے بچنا چاہتا ہے اس لیے وہ قیاس کا رُخ دوسری طرف پھیر کر اپنے نظر کی توجیہ اس طرح شروع کر دیتا ہے کہ ان تمام مصنوعات کی ابتدا غالباً صنعت کے ایک ہی ابتدائی بیج سے ہوئی تھی، پھر اس میں ارتقاء شروع ہوا اور ماحول کے فلاں فلاں اسباب سے ان اشیاء کی مختلف انواع وجود میں آئیں، پھر ان انواع نے ایک دوسرے کے خلاف کشمکش شروع کی اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے ماحول سے اپنے آپ کو موافق کرنے اور ماحولی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس کشمکش میں جو مصنوعات ناکام رہ گئیں وہ مٹ گئیں اور جو کامیاب ہوئیں انھیں ماحول نے بقاء کے لیے چن لیا۔ یہی کشمکش ان مصنوعات کی شکلوں اور صفتوں کے ارتقاء کی موجب ہوئی اور بقاء کی جدوجہد ہی میں ایک نوع کی چیزیں ترقی کرتے کرتے دوسری نوع کی مصنوعات میں تبدیل ہوتی چلی گئیں، مثلاً چھکڑے کی نوع مدتوں تک زور لگاتی رہی یہاں تک کہ اس کے بعض قابل تر افراد کی ترکیب میں تغیرات رونما ہوتے چلے گئے اور بالآخر وہ گھبی میں تبدیل ہو گئے۔ پھر گھبی کی نوع نے زور لگانا شروع کیا حتیٰ کہ اس کے بعض قابل افراد کی ترکیب میں پھر تغیر آنے لگا اور بالآخر وہ موٹر میں تبدیل ہو گئے۔ پھر بعض موٹروں نے اونچے اونچے درختوں اور مکانوں اور عمارتوں کو دیکھ کر ان کے اوپر پہنچنا چاہا اور اس کوشش میں اچکنا شروع کیا یہاں تک کہ اچکتے اچکتے ان کے پر نکل آئے اور بالآخر وہ ہوائی جہاز میں تبدیل ہو گئیں۔ اس محقق جلیل کے ساتھ مریخ کے سائنس کالج سے جو طالب علم آئے تھے وہ عرض کرتے ہیں کہ قبلہ، چھکڑے سے گھبی اور گھبی سے موٹر اور موٹر سے ہوائی جہاز تک بتدریج جو ارتقاء ہوا ہو گا تو لازماً چھکڑے اور گھبی کے

درمیان، اور بگھی اور موٹر کے درمیان، اور موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان بکثرت ایسی کڑیاں پائی جانی چاہییں جو ان میں سے ہر دو نوعوں کے بیچ کا فاصلہ بھی طے کر رہی ہوں، اور اس فاصلہ میں ہر ہر قدم پر ان درمیانی کڑیوں کے مختلف افراد ایک قافلے کی طرح آگے پیچھے چلتے نظر آنے چاہییں۔ مثلاً بگھی اور موٹر کے درمیانی فاصلے میں بہت سی ایسی اقسام کی گاڑیاں ملنی چاہییں جو ابھی کچھ بگھی ہوں اور کچھ موٹر ہونے کے مختلف درجوں میں ہوں، اور اسی طرح موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان ایسی بہت سی اقسام کی سواریاں پائی جانی چاہییں جو ابھی پر نکال رہی ہوں۔ اس سوال کو سن کر پروفیسر صاحب کچھ دیر سوچتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہاں، یہ درمیانی کڑیاں ضرور پائی جاتی ہوں گی، بگھی سے "بگھ موٹرا" بنا ہوگا، پھر وہ "موٹر بگھے" میں تبدیل ہوا ہوگا، پھر اس نے "موٹر بگھ" کی شکل اختیار کی ہوگی، پھر وہ موٹر میں تبدیل ہو گیا جسے تم دیکھ ہی رہے ہو، پھر موٹرا اپنی ارتقائی جدوجہد سے "پنکھ موٹرا" بنی ہوگی، پھر وہ "موٹر پنکھ" میں تبدیل ہوئی ہوگی، پھر "موٹر پنکھا" پیدا ہوا ہوگا، پھر وہی تبدیل ہو کر یہ ہوائی جہاز بن گیا جو تمھارے سامنے موجود ہے۔ یہ بیچ کی کڑیاں جن کے نام میں نے لیے ہیں ضرور کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہوں گی، جاؤ اور مٹی کے ڈھیروں میں انھیں تلاش کرو۔ استاد تو یہ کہکر خاموش ہو گیا، مگر شاگرد جو مرنج ہی سے انسان کے خلاف ایک تعصب دل میں لیے ہوئے آئے تھے، اس کی اس نادر تحقیق پر ایسا ایمان لائے کہ انھوں نے استاد کے کلام میں سے "غالباً" اور "ہوا ہوگا" کو بھی نکال دیا اور اب وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کو "یقیناً" اور "ہے" کے ساتھ بیان کرنے لگے ہیں۔ ان کے علمی لکچروں میں "موٹر بگھا" اور "پنکھ موٹرا" وغیرہ خیالی موجودات کا ذکر اس طرح آتا ہے گویا کہ یہ چیزیں کہیں ان کے میوزیم میں موجود ہیں۔

ڈارون کے نظریہ اور ڈارونیت کے متبعین پر یہ تمثیل بالکل ٹھیک ٹھیک راست آتی ہے۔ اس نظریہ کے اصلی لٹریچر کو آپ دیکھیں گے تو آپکو معلوم ہوگا کہ اسکی ساری بنیاد "ہوگا" پر ہے، حالانکہ سائنس میں اصل قابل اعتبار چیز "ہے" ہے نہ کہ "ہوگا"۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر سائنس میں "ہوگا" کی بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے تو ایک "ہوگا" اور دوسرے "ہوگا" میں فرق کیوں ہو، خصوصاً جبکہ ایک "ہوگا" دوسرے "ہوگا" سے کچھ زیادہ ہی لگتا ہوا ہو۔ جب آپ اس کے لیے تیار ہیں کہ شہوات کی توجیہ میں "ہوگا" کو بھی مان لیں تو ڈارون کے "ہوگا" سے میرا یہ "ہوگا" کچھ زیادہ

ہی لگتا ہوا ہے کہ زندگی کا آغاز اور زندہ اشیاء کا تنوع اور ان کا تفاضل سب کا سب ایک حکیم کے امر اور یکساں تدبر سے ہے۔ میرا "یہ ہوگا" ڈارون کے "ہوگا" سے زیادہ بہتر طریقہ پر تمام شہوات کی توجیہ کرتا ہے، کسی سوال کو لاجواب نہیں چھوڑتا، اور سب سے بڑھ کر اس کے حق میں وجہ ترجیح یہ ہے کہ اُس طرف تو کوئی آدمی صداقت کے ساتھ "ہوگا" سے زیادہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہے مگر اس طرف کثرت صالح ترین انسان، جو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پائے گئے، پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ "ہے" اور ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں کہ "ہے"۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سائنس کے طالب علم ادھر آنے کے بجائے اُدھر جا رہے ہیں؟ کیا اس کی کوئی وجہ اُس خدا بیزاری (Theopholia) کے سوا ہے جو قرون متوسطہ سے سائنس کے طالب علموں کو میراث میں ملی ہے؟ اگر یہی بات ہے تو "جذبات" کا نام لوگوں نے "علم" کیوں رکھ چھوڑا ہے۔

علمی اور عقلی حیثیت سے اس نظریہ میں جو کمزوریاں ہیں ان سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے کہ فلسفے اور اخلاق اور علوم تمدن و اجتماع میں داخل ہو کر اس ظالم تخیل نے انسان کو برباد کرنے کے لیے کیسے شدید فتنے برپا کیے ہیں، تو شاید کسی صاحب بصیرت آدمی کو یہ ماننے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں جن نظریات نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کی ہے، یہ ڈارونیت ان سب کی سرتاج ہے۔ اگر انسان کی فلاح چاہنے والوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو وہ اس نظریے کی تعلیم دینے والوں کے ساتھ اس سے زیادہ سخت برتاؤ کریں جو انارکی پھیلانے کے لیے بم سازی اور ڈاکہ زنی کی تعلیم و تبلیغ کرنے والوں سے کیا جاتا ہے۔

نواقض وضو

"اسلام نے جسم و لباس کی طہارت و نظافت کا جو لحاظ رکھا ہے اس کی قدر و قیمت سے عقل انسانی انکار نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں بعض جزئیات بالکل ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ریح کے نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا، حالانکہ جسم کے ایک حصہ سے محض ایک ہوا کے نکل جانے میں بظاہر

کوئی ایسی نجاست نہیں ہے جس سے وضو ساقط ہو جائے۔ آخر اس ہوا سے کیا چیز گندی ہو جاتی ہے؟ اسی طرح پیشاب کرنے سے وضو کا سقوط، حالانکہ اگر احتیاط سے پیشاب کیا جائے اور پھر اچھی طرح دھو لیا جائے تو کہیں کوئی نجاست لگی نہیں رہ جاتی۔ یہی حال دوسرے نواقض وضو کا ہے جس سے وضو ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ براہ کرم اس الجھن کو اس طرح دور کیجیے کہ مجھے عقلی اطمینان حاصل ہو جائے۔"

نواقض وضو کے مسئلے میں آپ کو جو شبہات پیش آئے ہیں انھیں اگر آپ حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ شریعت میں جن جن باتوں سے وضو کے ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کا حکم لگایا گیا ہے پہلے ان سب کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے، پھر خود اپنے طور پر سوچیے کہ عام انسانوں کے لیے (جن میں عالم اور جاہل، عاقل اور کم عقل، طہارت پسند اور طہارت سے غفلت کرنے والے، سب ہی قسم کے لوگ مختلف درجات و حالات کے موجود ہیں) آپ کو ایک ایسا ضابطہ بنانا ہے جس میں حسب ذیل خصوصیات موجود ہوں

(۱) لوگوں کو بار بار صاف اور پاک ہوتے رہنے پر مجبور کیا جائے اور ان میں نظافت کی حس اس قدر بیدار کر دی جائے کہ وہ نجاستوں اور کثافتوں سے خود بچنے لگیں۔

(۲) خدا کے سامنے حاضر ہونے کی اہمیت اور امتیازی حیثیت ذہن میں بٹھائی جائے تاکہ نیم شعوری طور پر آدمی خود بخود اپنے اندر یہ محسوس کرنے لگے کہ نماز کے قابل ہونے کی حالت دنیا کی دوسری مشغولیتوں کے قابل ہونے کی حالت سے لازماً مختلف ہے۔

(۳) لوگوں کو اپنے نفس اور اس کے حال کی طرف توجہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ وہ اپنے پاک یا ناپاک ہونے، اور ایسے ہی دوسرے احوال سے جو ان پر وارد ہوتے رہتے ہیں، بے خبر نہ ہونے پائیں اور ایک طرح سے خود اپنے وجود کا جائزہ لیتے رہیں

(۴) ضابطہ کی تفصیلات کو ہر شخص کے اپنے فیصلہ اور رائے پر نہ چھوڑا جائے بلکہ ایک طریق کار

معین ہو تاکہ انفرادی طور پر لوگ طہارت میں افراط و تفریط نہ کریں۔

(۵) ضابطہ اس طرح بنایا جائے کہ اس میں اعتدال کے ساتھ طہارت کا مقصد حاصل ہو۔ نہ اتنی سختی ہو کہ زندگی تنگ ہو کر رہ جائے اور نہ اتنی نرمی کہ پاکیزگی ہی باقی نہ رہے۔

ان پانچ خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر آپ خود ایک ضابطہ تجویز کریں اور خیال رکھیں کہ اس میں کوئی بات اُس نوعیت کی نہ آنے پائے جس پر وہ اعتراضات ہو سکتے ہوں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔ اس قسم کا ضابطہ بنانے کی کوشش میں اگر آپ صرف ایک ہفتہ صرف کریں گے تو آپ کی سمجھ میں خود بخود یہ بات آ جائیگی کہ ان خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر صفائی و طہارت کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا جا سکتا جس پر اُس نوعیت کے اعتراضات وارد نہ ہو سکتے ہوں جو آپ نے پیش کیے ہیں۔ آپ کو بہرحال کچھ چیزیں ایسی مقرر کرنی پڑیں گی جن کے پیش آنے پر ایک طہارت کو ختم شدہ فرض کرنا اور دوسری طہارت کو ضروری قرار دینا ہو گا۔ آپ کو یہ بھی متعین کرنا ہو گا کہ ایک طہارت کی مدتِ قیام (Duration) کن حدود تک رہے گی اور کن حدود پر ختم ہو جائے گی۔ اس غرض کے لیے جو حدیں بھی آپ تجویز کریں گے ان میں ناپاکی ظاہر اور نمایاں اور محسوس نہ ہو گی بلکہ فرضی اور حکمی ہی ہو گی اور لامحالہ بعض حوادث ہی کو حد بندی کے لیے نشان مقرر کرنا ہو گا۔ پھر آپ خود غور کیجیے کہ آپ کی تجویز کردہ حدیں ان اعتراضات سے کس طرح بچ سکتی ہیں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

جب آپ اس زاویۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو آپ خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ شارع نے جو ضابطہ تجویز کر دیا ہے وہی ان اغراض کے لیے بہترین اور غایت درجہ معتدل ہے۔ اس کے ایک ایک جزئیہ کو الگ الگ لے کر علت و معلول اور سبب و مسبب کا ربط تلاش کرنا معقول طریقہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا بحیثیت مجموعی ان اغراض و مصالح کے لیے جو اوپر بیان ہوئی ہیں، اس سے بہتر اور جامع تر کوئی ضابطہ تجویز کیا جا سکتا ہے؟ لوگوں کو احکام وضو میں جو غلط فہمی پیش آتی ہے اس کی

اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اُس بنیادی حکمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو بحیثیت مجموعی ان احکام میں ملحوظ رکھی گئی ہے بلکہ ایک ایک جزئی حکم کے متعلق یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں فعل میں آخر کیا بات ہے کہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی ضرب آخر کس طرح شکستِ وضو کا سبب بن جاتی ہے۔

آلات کے ذریعہ توالد و تناسل

"کیمیاوی آلات کے ذریعہ سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو، تو یہ عمل مضرت سے خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں؟ اور اس عمل کی معمولہ زانیہ شمار کی جائے گی اور اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟ اس امر کا خیال رکھیے کہ آج کل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے۔ وہ اگر سائنٹفک طریقوں سے اپنے حصہ کا نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کر دے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے"۔ امریکہ میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے"۔

آلات کے ذریعہ استقرارِ حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لیے اس عمل کا تصور ہی ناقابلِ برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک گرا دی جائے۔ آخر انسان کی صنفِ اناث اور حیوانات کی مادہ میں کچھ تو فرق رہنے دیجیے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ توالد و تناسل کا مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے کہ گھوڑیوں کو ان کے نروں سے ملنے کی لذت ان کو حاصل نہیں کرنے دیتا اور ان سے صرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان خود اپنی مادہ سے بھی یہی برتاؤ کرے تو اس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔ آج کی "فیشن دار" عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل اس کی فطرت کو مصنوعی فکری و صنفی ماحول نے مسخ کر دیا ہے، ورنہ اگر وہ صحیح انسانی فطرت پر ہو تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار، ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرے۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی قدرتی بنیاد ہے۔ فطرت الٰہی نے عورت اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے

کہ ان میں مودت ہو حسنِ معاشرت ہو، مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی نشوونما حاصل کرے۔ اس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ لہٰذا وہی اولاد جائز اولاد ہے جو قیدِ نکاح میں پیدا ہو۔ اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے۔ اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو اسے حلالی نہیں کہا جا سکتا۔ شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔ نیز اس کا سلسلۂ آبائی منقطع ہوگا اور وہ باپ کے ورثہ سے محروم رہے گا جو قطعی طور پر اس کی حق تلفی ہے۔

پھر غور تو کیجیے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار کون ہوگا؟ صرف ماں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچہ کے لیے ماں اور باپ چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کیے ہیں ان میں سے آدھے ساقط کر دیے جائیں اور وہ صرف سلسلۂ مادری پر منحصر رہ جائے؟ کیا دنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری تو قائم رہے مگر مرد ہمیشہ کے لیے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے؟

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے "امتحانی نلیوں" میں پالا جائے۔ یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے

آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن — می تواں دیدن جنین اندر بدن
پرورش گیرد جنیں نوعِ دگر — بے شبِ ارحام در یابد سحر
آنچہ از نیساں فرو ریزد دگیر — لے صدف! در زیرِ دریا تشنہ میر

(جاوید نامہ)

جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی عورت چاہے گی کہ مجھے صرف بچہ جننے کی تکلیف دی جائے، اس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ یہ صورت جب رونما ہوگی تو انسانی بچے اسی طرح "کثیر پیداآوری" ( ) کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں۔ یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اس کا اسفل السافلین ہوگا ان "کارخانہ ہائے نسل کشی" سے انسان نہیں بلکہ دو ٹنگے جانور پیدا ہوں گے جن میں انسانی شرف کی خو بو برائے نام بھی نہ ہوگی اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہوگا جو تمدن کی رنگا رنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں تو وہ مادہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں۔ اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

مشینی امامت

"ریڈیو ایک ایسا آلہ ہے، جو ایک شخص کی آواز کو سینکڑوں میل دور پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح گراموفون کے ریکارڈوں میں انسانی آواز کو محفوظ کر لیا جاتا ہے اور پھر اسی خاص طریقوں سے دہرایا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی امام ہزاروں میل کے فاصلے کو بذریعہ ریڈیو امامت کرائے یا کسی امام کی آواز کو گراموفون ریکارڈ میں منضبط کر لیا گیا ہو اور اسے دہرایا جائے، تو کیا ان آلاتی آوازوں کی اقتدا میں نماز کی جماعت کرنا جائز ہے؟

ریڈیو پر ایک شخص کی امامت میں دور دراز کے مقامات کے لوگوں کا نماز پڑھنا یا گراموفون کے ذریعہ نماز کا ریکارڈ بنانا اور پھر کسی جماعت کا اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا اصولاً صحیح نہیں ہے۔ اس کے وجوہ آپ غور کریں تو خود آپ کی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

امام کا کام محض نماز پڑھانا ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک طرح سے مقامی جماعت کا رہنما ہے۔ اس کو اپنے مقام کے لوگوں سے شخصی ارتباط قائم کرنا، ان کے اخلاق، معاملات اور مقامی حالات پر نظر رکھنا اور حسب موقع و ضرورت اپنے خطبوں میں یا دوسرے مفید مواقع پر اصلاح و ارشاد کے فرائض انجام دینا چاہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں کی دوسری چیزوں کے ساتھ اس ادارہ میں بھی اب انحطاط رونما ہو گیا ہے۔ لیکن بہرحال نفس ادارہ کو تو اپنی اصلی صورت پر قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر ریڈیو پر نمازیں ہونے لگیں یا گراموفون سے امامت و خطابت کا کام لیا جانے لگے تو امامت کی اصل رُوح ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی۔

نماز دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی طرح محض "پوجا" نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی امامت سے شخصیت کو خارج کر دینا اور اس میں "مشینیت" پیدا کر دینا دراصل اس کی قدر و قیمت کو ضائع کر دینا ہے۔

علاوہ بریں اگر کسی مرکزی مقام سے کوئی شخص ریڈیو یا گراموفون کے ذریعہ سے امامت و خطابت کے فرائض انجام دے اور مقامی امامتوں کا خاتمہ کر دیا جائے تو یہ ایک ایسی مصنوعی یکسانیت ہو گی جو اسلام کی جمہوری روح کو ختم کر دے گی اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ کو ترقی دے گی۔ یہ چیز ان نظامات کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے جن میں پوری پوری آبادیوں کو ایک مرکز سے کنٹرول کرنے اور تمام لوگوں کو ایک لیڈر کا بالکلیہ تابع بنا دینے کا اصول اختیار کیا گیا ہے، جیسے فاشزم اور کمیونزم۔ لیکن اسلام ایک مرکزی امام یا امیر کے اقتدار کو ایسا ہمہ گیر بنانا نہیں چاہتا کہ مقامی لوگوں کی باگ ڈور بالکل اُس کے ہاتھوں میں چلی جائے اور خود ان کے اندر اپنے مفاد کو سوچنے، اپنے معاملات کو سمجھنے اور ان کو طے کرنے کی صلاحیت ہی نشوونما نہ پا سکے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن خیر القرون میں "امام" محض پجاری کی حیثیت نہیں رکھتے تھے جن کا کام چند مذہبی مراسم کو ادا کرا دینا ہو بلکہ وہ مقامی لیڈر کے طور پر مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کا کام تعلیم و تزکیہ اور اصلاح تمدن و معاشرت تھا اور مقامی جماعتوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا تھا کہ وہ بڑی اور مرکزی جماعت کی فلاح و بہبود میں اپنی قابلیتوں کے مطابق حصہ لیں۔ ایسے اہم مقاصد ریڈیو سیٹ یا گراموفون سے

کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔ آلات انسان کا بدل کبھی نہیں ہو سکتے، صرف مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں سمجھتا ہوں کہ "مشینی امامت" اسلام کی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے۔

پیشۂ وکالت اسلامی نقطۂ نظر سے

"میں نے حال ہی میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے، اور اس پیشہ میں خاصا کامیاب ہوا ہوں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ایک وکیل کو قوانین الٰہیہ کے برخلاف روزانہ قوانینِ انسانی کی بنا پر مقدمات لڑانے پڑتے ہیں۔ وہ اپنا پورا زور لگا کر اس چیز کو حق ثابت کرتا ہے جسے انسانی قوانین حق قرار دیتے ہیں خواہ خدائی قانون کی رو سے وہ حق ہو یا نہ ہو۔ اور اسی طرح باطل ہے ثابت کرتا ہے جو ان قوانین کی رو سے باطل ہے خواہ قانونِ الٰہی کے تحت وہ حق ہی کیوں نہ ہو محتاط سے محتاط وکیل بھی عدالت کے دروازے میں قدم رکھتے ہی معاً حق و باطل اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اس معیار کو تسلیم کرتا ہے جس کو انسان کی خام کار عقل نے اپنی خواہشاتِ نفس کے ماتحت مقرر کر رکھا ہے۔ غرضیکہ ایک وکیل کفر کی اچھی خاصی نمائندگی کے فرائض انجام دیتا ہے لیکن کوئی اور پیشہ بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا جسے اختیار کر کے آدمی نجاستوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس دہری مشکل کا حل کیا ہے؟ میں یہ سوال اس مسافر کی طرح پوری آمادگیٔ عمل کے ساتھ کر رہا ہوں جو پا برکاب کھڑا ہو۔"

اپنے پیشہ کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ سو فی صدی صحیح ہے اور آپ کی سلامتِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص حلال رزق حاصل کرنا اور مطابقِ شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچ کر کم حرام

اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے، اور بغاوت سے بچ کر ایسی معصیت کو مجبوراً گوارا کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ چکے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہرحال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔

عالمانہ جاہلیت

"ایک عالمِ دین اور صاحبِ دل بزرگ خطبات اور سیاسی کشمکش (جلد ۳) پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ملازمتیں غیر اللہ کی اطاعت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ یہ تو اپنی اور اپنے اہلِ ملک کی خدمت ہے۔ یہ صد درجہ غلط طریق کار ہے کہ خزائن ارض پر ہندو اور سکھ بطور حاکم مسلط ہوں اور مسلمان شودر کی حیثیت میں صرف مطالبہ گذار بن کر رہ جائیں، اور ملازمت کریں بھی تو اس کی آمدنی کو حرام سمجھ کر کھایا کریں۔ میں حیران ہوں کہ ان کو کیا جواب دوں"۔

جن صاحب کے اعتراض کا آپ نے ذکر کیا ہے اگر ان کے متعلق آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ عالمِ دین اور صاحبِ دل ہیں تو ان کے اعتراضات کو پڑھ کر میں اس کے بالکل برعکس رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا اور صبر کر لیتا، لیکن اب آپ سے یہ معلوم کر کے کہ وہ ماشاء اللہ دل اور دین دونوں رکھتے ہیں، ان کے یہ خیالات میرے لیے سخت حیرت کے موجب ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ جب اس قسم کی باتیں کریں تو ان سے کوسوں دور رہنا چاہیے۔ بھٹکے ہوئے جاہلوں کو سمجھایا جا سکتا ہے، مگر بھٹکے ہوئے عالموں کو سمجھانے کی کوشش فضول ہے۔ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا میرے بس میں نہیں ہے، اور اگر اس کو پڑھ کر بھی ان

لوگوں کا اطمینان نہیں ہوتا تو جس راستہ پر یہ چل رہے ہیں، اُسی پر چلے جائیں۔ مرنے کے بعد حقیقت ان پر بھی کُھل جائے گی اور مجھ پر بھی۔

(نوٹ) اس سے پہلے کے استفسار میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان کے بالمقابل ذرا ان خیالات پر بھی نگاہ ڈالیے۔ ایک طرف ایک جدید تعلیمیافتہ سیدھا سادہ مسلمان ہے اور دوسری طرف ایک عالم دین اور صاحب دل بزرگ۔ اس تقابل سے اندازہ کیجیے کہ جس گروہ کی امتیازی علامت ہی تقویٰ ہونی چاہیے وہ کیا انداز فکر رکھتا ہے اور تاویل کے ہتھیار سے کس طرح شریعت کی شہر پناہ میں رخنے پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف اس گروہ کو دیکھیے جو دہریت کی اس فضا میں جدید نا خدا آشنا تعلیم و تربیت کے زہراب سے پرورش پاتا ہے، وہ دعوت حق کو کس آسانی سے سمجھتا ہے اور کتنے مضبوط تقویٰ کا ثبوت دیتا ہے۔

کاسبِ حرام کے ساتھ معاشی تعلقات کی حدود

"(۱) مشترک کاروبار جس میں صالحین و فاجرین ملے جلے ہوں، پھر فاجرین میں بائع خمر، آکل ربٰو، وغیرہ شامل ہوں، اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

(۲) کاسب حرام سے روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(۳) کاسب حرام کے ہاں نوکر رہنا یا اس کے ہاں سے کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟"

(۱) تجارت اگر بجائے خود حلال نوعیت کی ہو، اور جائز طریقوں سے کی جائے، تو اس میں کسی پرہیزگار آدمی کی شرکت محض اس وجہ سے ناجائز نہیں ہو سکتی کہ دوسرے شرکا اپنا مال حرام ذرائع سے کما کر لائے ہیں۔ آپ کا اپنا سرمایہ اگر حلال ہے، اور کاروبار حلال طریقوں سے کیا جا رہا ہے، تو جو منافع آپ کو اپنے سرمایہ پر ملے گا، وہ آپ کے لیے حلال ہو گا۔

(۲) کاسب حرام سے قرض لے کر کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۳) کاسب حرام کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا پیشہ فحشاء کی تعریف میں آتا ہو، مثلاً زنان

بازاری کا کسب۔ اس کے قریب جانا بھی جائز نہیں، کجا کہ اس کے ہاں نوکر ہونا۔ دوسرا وہ کاسب حرام ہے جس کا پیشہ حرام تو ہے، مگر فحشار کی تعریف میں نہیں آتا جیسے وکیل یا سودی ذرائع سے کمانے والا۔ اس کے کسی ایسے کام میں نوکری کرنا جس میں آدمی کو خود بھی حرام کام کرنے پڑتے ہوں، مثلاً سود خوار کی سودی رقمیں فراہم کرنے کا کام، یا وکیل کے محرر کا کام، تو یہ حرام ہے۔ لیکن اس کے ہاں ایسے کام پر نوکری یا مزدوری کرنا جو بجائے خود حلال نوعیت کا ہو، مثلاً اس کی روٹی پکا دینا، یا اس کے ہاں سائیس یا ڈرائیور کا کام کرنا، یا اس کا مکان بنانے کی مزدوری، تو اس میں کوئی جرم نہیں۔ رہا اس کے ہاں کھانا کھانا، تو اس سے پرہیز ہی اولیٰ ہے۔

اسلام اور آلاتِ موسیقی

(۱) کیا آلاتِ موسیقی بنانا اور ان کی تجارت کرنا جائز ہے؟

(۲) کیا شادی بیاہ کے موقع پر باجے وغیرہ بجانا جائز ہے؟ نیز تفریحاً ان کا استعمال کیسا ہے؟

(۳) اگر جواب نفی میں ہو تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود تو ان کا استعمال نہیں کرتے، لیکن ایسے تعلق داروں کے ہاں بخوف کشیدگی چلے جاتے ہیں جو آلاتِ موسیقی کا استعمال کرتے ہیں؟

(۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونے کی اجازت ہے جہاں آلاتِ موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو؟

(۵) آلاتِ لہو کے حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ آنحضورؐ کے زمانہ میں دف ہی ایک آلۂ موسیقی عرب میں رائج تھا، اور آپ نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، لہٰذا ہمارے زمانہ میں دف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں مستعمل ہو گئی ہیں تو ان کا استعمال کیوں ناروا ہو؟

(۶) کیا دف آلاتِ لہو میں شامل ہے؟

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں آلاتِ موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں"۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو نبی اس کام کے لیے بھیجا گیا ہو اس کے پیرو انھیں آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کے لیے اپنی قوتیں استعمال کریں۔

(۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور، باجے بجانا کسی حال میں درست نہیں۔

(۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے۔ جو رسول اور اصحاب رسول کے ساتھ اپنا حشر چاہتے ہوں۔ ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھیں جنھیں احکام شریعت کی پروا نہیں۔ ورنہ جن کو ان لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں، انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جا سکتا جب تمھاری دنیا فاجروں کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی انھیں کا ساتھ نصیب ہوگا۔

(۴) جواب ملاحظہ ہو مگر یہ خیال رہے کہ مجلس نکاح میں جبکہ ایجاب و قبول ہو رہا ہو اور منکرات و فواحش کی نمائش نہ ہو رہی ہو، شرکت کرنے میں مضائقہ نہیں۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی و شرافت کیساتھ یہ کہکر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمھارے جائز کاموں کا تعلق ہے ہم تمھاری مسرت میں دل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم ان خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دف کے سوا اُس زمانہ میں اور کوئی دوسرا آلۂ موسیقی نہ تھا۔ ایران اور روم اور مصر کی تمدنی تاریخ اور خود عربِ جاہلیت کی تمدنی تاریخ سے جو شخص جاہلِ محض ہو وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعارِ جاہلیت میں ملتے ہیں۔

(۶) دف کا نام اگر آلاتِ موسیقی میں شامل ہو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور عید کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی اجازت دی ہے اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک آگے دی جا سکتی ہے۔ اس آخری حد کو جو شخص نقطۂ آغاز بنانا چاہتا ہو اس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ مخواہ اس نبی کے پیرووں میں اپنا نام لکھوائے جو آلاتِ موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے؟

اشتراکیت کا مقابلہ

"اشتراکیت بری طرح نوجوانوں میں نشوونما پانے لگی ہے۔ اس سلسلہ میں رہنمائی کی بڑی ضرورت ہے اگر آپ اس کے مقابلہ کی طرف توجہ کریں، اور اس کی تردید کے لیے قلم اٹھائیں، تو غالباً وقت کا ایک اہم تقاضا پورا ہو جائے گا۔"

اشتراکیت کے مقابلہ کی طرف مجھے توجہ ہے۔ سات آٹھ برس اس کے مطالعہ میں صرف کر چکا ہوں اور اس کے ساتھ اسلام کے معاشی نظام کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے، لیکن جس وجہ سے اب تک اس چیز پر براہِ راست حملہ نہیں کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اشتراکیت کا مقابلہ محض ایک آدھ کتاب یا چند مضامین سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک تحریک ہے جو ۸۰، ۹۰ سال کے اندر بڑے ساز و سامان اور بڑی زبردست علمی تیاریوں کے ساتھ پرورش پا کر دنیا پر چھا گئی ہے۔ اس کا ایک پورا نظامِ فلسفہ ہے جس پر اخلاق، تمدن، معیشت، معاشرت، ادب، تعلیم، علومِ طبیعی، غرض تمام شعبہ ہائے زندگی کے متعلق ایک ہمہ گیر "دین" کی عمارت قائم کی گئی ہے، اور پھر وہ کاغذ ہی پر نہیں بنی ہے بلکہ ہزاروں لاکھوں ذہین، ذی علم، جفاکش اور ایثار پیشہ لوگوں نے سالہا سال کی محنتوں سے اس دین کو ایک تحریک کی شکل میں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا ہے اور ایک وسیع خطۂ زمین میں اس کی بنیاد پر ایک نہایت طاقتور حکومت عملاً چلا کر دکھائی ہے۔ ایسی تحریک کا مقابلہ صرف ایک تحریک ہی کر سکتی ہے جس کی پشت پر ایک ایسی جماعت ہو جو علمی ہتھیاروں سے بھی مسلح ہو، کیرکٹر کی طاقت بھی رکھتی ہو، عمل اور قربانی کے میدان میں بھی ٹکر لے سکتی ہو، اور پھر وہ اتنی تیار ہو کہ جس دین کو وہ دینِ مارکس کے مقابلہ میں لے کر اٹھے اس کی ترجمانی زندگی کے ہر شعبہ میں مارکسیوں سے زیادہ کامیاب علمی و عملی طریقوں سے کر سکے۔ اسی لیے میں نے اشتراکیت کے خلاف محض دل کی تسلی کے لیے کوئی کتاب یا مضمون لکھنے کے بجائے وہ پروگرام اختیار کیا ہے جسے آپ جماعتِ اسلامی کی تحریک کی صورت میں اس وقت عہدِ طفولیت سے گذرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ میں پوری قوت کے ساتھ نہ صرف دینِ مارکس بلکہ ہر دینِ باطل کے مقابلہ میں اترنا چاہتا ہوں اور اسی کی تیاری کر رہا ہوں اللہ مدد فرمائے۔